پروفیسر ڈاکٹر حیدر سندھی

تیسری قسط

سندھی ادب کا مختصر جائزہ

شعری اصناف، اپنے تاریخی تناظر میں

اپنے عہد میں انہیں اس خیال سے اولین شاعر کہا جائے گا کہ سہ دور کے جتنے بھی ابیات دستیاب ہوئے ہیں وہ سب محدود مصرعوں کے ہیں جبکہ طالب مرحوم کے ابیات مصرعوں کے محتاج نظر نہیں آتے۔ آپ کے ایک کلام کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں اپنے عہد سے چار صدیاں بعد آنے والی بیسویں صدی کے سندھ میں رونما ہونے والے واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ایندو سندھ، اتر کھئوں، خاصو کھلے دار۔
ڈیندو سبھنی بھلی بھت مار
کین کھندو کوئی کھنندو نہ کوئی خار
تھیندو نہ کوئی، ھنن سندو یار
لھندو طالب لیکن کوئی، کھنجی سار
بھاری وجھندو ھر ھک متھاں بار
روکیندو جل، کین وھندو سندھو تار
ھر کو چوندو آئی بلاتوں ٹار

ماریندو کان، تھیندو سسئی پار
چالن جو وچھائیندو چؤطرف جار۔۔۔۔الخ**

"طویل بیت" پیر محمد لکھوی کے بھی موجود ہیں جنہیں ملکی (مقامی) سندھی میں لکھا گیا ہے۔ اس ملکی سندھی میں تصنیف، تدریس، تالیف اور تخلیق کا باقاعدہ کام بعد میں میاں ابوالحسن، میاں محمد حسین، مخدوم ضیاء الدین، مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی، مخدوم عبداللہ نرئے واڑہ اور مخدوم عبدالرحیم گرھوڑی وغیرہ نے بھی کیا۔ اس طرز یا انداز تحریر کو تاریخ میں "سندھیوں" سے پکارا گیا ہے۔ (۳۸) تاہم دیگر "سندھیوں کے مقابلے میں پیر محمد لکھوی کی "سندھی" اس وجہ سے قدرے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے کہ اس میں بادصبا کو، پیامبر بنا کر شاعر نے حضور اکرمؐ کے حضور بھیجنا چاہا تاکہ یہ صبح کی مہک بھری مشک دار ہوا، شاعر کے لئے شفا لائے۔ (۳۹)

پیر محمد لکھوی کا سال وفات سن ۱۶۰۰ع ہے۔ اس اعتبار سے مذکورہ بیت یقینی طور پر سمہ دور کا ہے۔ تاہم "ساموئی درویشوں" (جنہیں فارسی محاورے میں "ہفت تن" کہا جاتا ہے) کے اشعار تو ہیں ہی سمہ دور کے۔ روایتوں کے لحاظ سے یہ ساتوں درویش "ساموئی" کے مقام پر جمع ہوئے اور ہر ایک نے سندھ کے مستقبل کو سامنے رکھ کر ایک ایک بیت پڑھا۔ ان ابیات کو اردو املا میں لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۱- سندھ کا ایک قدیم دریا ہاکڑا جو اس وقت خشک ہے پھر سے تار ہو کر بہنے لگے گا۔ جو بند باندھ کر اسے روکا گیا ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔ کنول کی جڑ "بہ" (نزرو) مچھلی اور آبی سبزی لوڑھ جو اس وقت وافر ملتے ہیں وہ نایاب ہو جائیں گے اور اتنے اہم سمجھے جائیں گے کہ حکمران کو تحفے

** مصنف کو مذکورہ معلومات اور ابیات محمد شریف شاد صاحب نے ۱۹۹۵ء میں شکارپور سندھ سے ارسال کیں جس کے لیے مصنف ان کا ممنون ہے۔

کے طور پر بھیجے جائیں گے۔

۲- دریائے ہاکڑا سے اس وقت آباد ہونے والا علاقہ شاداب ہے لیکن جلد ہی غیر آباد و بنجر بن جائے گا۔ غیر آباد ہونے کے باعث یہاں آباد بلوچ قبائل جو بہادری اور شجاعت میں مثالی نہیں رکھتے وہ اس قدر تنگ دست ہوجائیں گے کہ اپنے بچے سستا بیچنے پر مجبور ہوجائیں گے۔

۳- طرفین کے درمیان معاہدہ شکنی ہوگی، چھ پہر (۱۸ گھنٹے) کی جنگ ہوگی۔ دشمنوں کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوگا جس کے بعد سندھ کی قسمت یاوری ہوگی اور خوشحالی آئے گی۔

۴- ہلاکت پانے والے دشمنوں کی نشانیاں یہ بتائی گئی ہیں: سیاہ لباس زیب تن ہوگا اور سر پر لمبے بال ہوں گے۔

۵- دشمنی اور عداوت کی بنیاد زیریں سندھ (لاڑ) میں رکھی جائے گی جس سے شمالی سندھ زیادہ متاثر ہوگا۔ نتیجتاً قندھار کی طرف سے سندھ پر حملے کی راہ ہموار ہوگی۔

۶- سیاہی مائل نیلے اور کمزور گھوڑے شمال کی طرف سے سندھ میں آئیں گے۔ اس کے بعد بلوچی فراک (گگھا) کی طرح کا لباس پہنے عورتوں کی سندھ میں آمد ہوگی۔ اس کے بعد تاجانہ قوم کے لوگوں کو فتح و کامرانی حاصل ہوگی۔

۷- باہر کے لوگوں کی ٹھٹہ پر یلغار ہوگی اس وقت لوگو تم نئی تعمیر ختم کر لینا اور اپنے مکان جس حال میں بھی ہو انہی کے اندر رہنا۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے بیت نمبر ایک اور سات کا زمانہ سومرا دور کے زوال اور سمہ دور کے عروج سے تعبیر کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا ہے کہ مذکورہ ابیات سومرا حکمرانوں کے حامیوں اور خیر خواہوں کی سمہ دور حکومت کے دوران کی خواہشات کی عکاسی کرتے ہیں اور سومرا دور واپس آنے کی تمنا موجود ہے۔ (ص ۹۶ تا ۱۰۰) لیکن بعض محققین نے بیت نمبر ایک، دو اور سات کو حقیقی پیش گوئی تسلیم کیا ہے۔ (۴۰)

یہاں پر ان پیشن گوئیوں کی صداقت کے متعلق یہ بحث ضروری نہیں کہ ان پیشن گوئیوں میں صداقت ہے یا نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ بیت سندھ کے شعراء کی پسندیدہ اور اہل سندھ کی قدیم اور مقبول ترین صنف شاعری ہے۔

سہ دور میں بیت کی شاعری کے علاوہ بیت کی گائکی کے انداز میں بھی اضافہ ہوا اور ایک اور شاخ "نڑ بیت" نمودار ہوئی۔ نڑ بیت دراصل اپنی ترتیب، ہیئت اور ساخت کے لحاظ رائج واقعاتی بیت کی طرح ہے لیکن زیر تذکرہ دور کے حوالے سے اس کی ادائیگی اور گائیکی میں مزید ندرت آئی۔ اس قسم کا بیت "ن ئے" یا "نڑ" (ایک لمبی بانسری کی طرح لی نئے) کی مخصوص لے کے ساتھ گائے جانے کی وجہ سے اس پر یہ نام پڑا اور اسے زیادہ مقبولیت اور شہرت ملی۔ تاہم مضمون و مفہوم کے خیال سے بیت کو وطن، وطنیت، حب وطن، وطن کے محافظوں، حشمت و دہشت کی وارث ہستیوں، ویروں اور دلیروں کی مہم جوئی، دلیری، کامیابیوں، شجاعت اور بہادری کی داستانوں اور قصوں کو منظوم و موزوں کرنے کے لئے بہترین اور سازگار سمجھا گیا۔

تاریخ کے اس عہد میں سندھ کے خلاف دوبارہ سازشیں شروع ہوئیں۔ انتشار اور افراتفری کی فضا پیدا کی گئی اور خوف و ہراس کے علاوہ افواہ پھیلا کر بے یقینی کی صورتحال عام کی گئی، جس نے علم و دانش کے طبقے کو بھی مایوس اور متاثر کیا اور وہ نظریاتی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک طبقہ وطن پرستی کو فروغ دے کر وطن دشمن قوتوں کی تمام سازشوں کا مقابلہ کرنے کا قائل تھا۔ اس طبقے کے سربراہ مخدوم بلاول تھے۔

مخدوم بلاول ذات کا سہ اور شاہی خاندان کا ایک انتہائی عالم فاضل فرد تھا۔ آپ حدیث اور فقہ میں سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ اعلیٰ پائے کے مفسر، متشرح اور مدرس تھے۔ (۴۱) محققین و علماء نے آپ کے عارف باللہ اور واصل باللہ ہونے کی تصدیق کی ہے۔

(۴۲) جبکہ اہل علم آپ کو ظاہری علوم میں بھی بہت بڑی علمی ہستی مانتے ہیں۔ (۴۳) تبصرہ نگاروں اور مؤرخین کے مطابق مخدوم بلاول کے پیش نظر وطن کی سالمیت، ترقی، خوشحالی اور سیاسی خودمختیاری تھی جبکہ دوسرے طبقے کے روح رواں، جام فیروز تھے جن کے والد جام نظام الدین (عرف جام نندہ) سندھ کے ہر دلعزیز حکمران تھے۔ عوام میں آپ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ لگاتار چار دہائیاں (۴۰ سال) سندھ کے حکمران رہے۔

اس تمام عرصے میں سندھ کی تمام سرحدیں محفوظ رہیں، اندرونی سازشوں کو موت آگئی اور سندھ میں اس قدر ترقی اور خوشحالی آئی کہ ہر سمت ہریالی، ہرے بھرے کھیت اور ہر گھر کے سامنے آنگن میں غلہ محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ مالوندا اور مویشی پالنے والے اکثر لوگ تھوڑا دودھ دینے والی بھینسوں اور گائیوں کو بغیر دودھ نکالے جنگل میں چرنے کے لئے کھول دیتے تھے۔

امن و امان کا یہ حال تھا کہ لوگ دکانوں اور گھروں کے دروازے کھلے چھوڑ جاتے تھے۔ مویشی رات کو بغیر باڑے کے کھلے میدانوں میں رہتے اور دن کو محافظوں کے بغیر چرتے رہتے۔ سانون (جسے سندھ میں سارنگ کہتے ہیں) میں تو اتنا عرصہ میدانوں میں مال مویشی چرتے رہتے کہ وہیں ان میں اضافے ہوتے رہتے۔ جب سردیوں کا موسم شروع ہوتا تب مالکان جنگلوں، چراگاہوں اور میدانوں سے مویشی ہانک کر گھروں میں لے آتے۔ لسی اور دودھ اتنا وافر ہوتا کہ بچھڑوں کو پلایا جاتا۔ مکھن اور گھی ارزاں تھے۔ شہد مٹکوں میں بھر کی بیچا جاتا۔

ایسے حاکم کے انتقال کے ساتھ ہی بارشی کیڑوں کی طرح اندرونی اور بیرونی سازشیں ابھر کر سامنے آگئیں اور امن امان سے لے کر لوگوں کے چین و سکون سمیت ہر چیز ختم

ہوئی۔ عوام کو یہ فکر دامن گیر ہوگئی کہ حاکم وقت جام فیروز کو تمام سازشوں سے بے خبر رکھنے کے لئے ان کے کانوں میں (جام نظام الدین کے زمانے سے سپہ سالار کے عہدے پر فائز وفادار، ایک محب وطن اور سرفروش سپاہی) دولھ دریا خان کے خلاف زہر بھر دیا گیا اور اس سے انہیں بدظن کیا گیا۔ بلکہ سازش کے تحت فوج میں دھڑے بندی کروا کر جنگ کا میدان ہموار کیا گیا۔ جنگ ہوئی، سندھی لشکر ایک دوسرے کے خلاف لڑا اور کٹ مرا۔ بڑے جانی نقصان کے بعد فوج کو منتشر کیا گیا اور دلھ دریا خان کو شہادت نصیب ہوئی۔

دولھ دریا خان کی حب الوطنی، قومی درد، ملکی سلامتی کا جذبہ اور ایمانداری، خلوص اور وفاداری کے علاوہ بہادری، دلیری، شجاعت پورے دور میں مشہور تھی۔ ان کی شہادت کے بعد ان کا کردار اور ان کی خوبیاں ادب میں آگئیں۔ بیت کے تمام رخوں میں دولھ دریا خان شہید جیسی ہمہ پہلو شخصیت کو بھرپور انداز میں اجاگر کیا جاتا رہا ہے۔

تاریخی حوالے کے مطابق جونہی اس جرنیل کو شہادت ملی تو انتشار اور افراتفری کے دروازے کھل گئے۔ ہر ایرے غیرے نے اہل سندھ کے آنگن میں سے راستے بنا لیے۔ ارغونوں کا سندھ پر قبضہ ہوگیا اور شاہ بیگ ارغون حاکم بنا۔

برصغیر کی تاریخ میں یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں مغل حکمران خاندان شاہجہان کے بیٹوں نے ان کی حکمرانی کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ پہلے ان کا اقتدار ڈگمگایا پھر ڈول گیا۔ اورنگزیب بادشاہ بنے اور اس نے اپنے بھائیوں سمیت ہر مخالفت کی سرکوبی کی تدابیر اختیار کیں اور سندھ کا ایک حصہ مغلوں کے قبضے میں آیا۔

ان ایام میں سندھ کی حالت یہ بنی کہ جو اپنے آپ کو حاکم تصور کرتے تھے، انہوں نے اپنے ہاتھ پاؤں ناحق خون میں لت پت کر کے عوام کے دلوں میں دہشت و وحشت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں عوام کی طرف سے انہیں نفرت و حقارت ملی اور وہ

قابض حکمران بن گئے۔ نتیجتاً وہ بھی نوابوں، سرداروں اور جاگیروں کے علاوہ پیروں اور نام نہاد ملاؤں کا مراعات یافتہ طبقہ بنا کر ان کا سہارا لینے پر مجبور ہوگئے۔ سرکاری سہولتوں اور رعایتوں پر پلنے والے اس طبقے نے اپنے طور طریقے وہی حکمرانوں والے اختیار کر لیے اور عوام پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے۔ جو طبقہ، گروہ یا علاقہ ان کی آنکھ میں آنکھ ملا کر بات کرتا اس پر نقاب پوشوں کی یلغار ہوجاتی، کھیت اجڑ جاتے، باغ جل جاتے، شہروں سے شعلے اٹھتے، گھروں کو لوٹا جاتا اور لوگ رحمت مانگنے کے لئے اپنے خالق و مالک سے مدد مانگ کر خاموش ہوجاتے۔ (۴۴)

ایسی صورتحال میں مخدوم بلاول کی سربراہی میں سندھ کے لئے سرفروشوں اور جانبازوں کے جتھے تیار کئے گئے۔ ان جتھوں کی سرگرمیوں نے عوام میں تحفظ کا احساس پیدا کیا اور ایسے کارکنوں سے عوامی ہمدردی بڑھ گئی۔ کامیابیوں نے ریاستی تشدد، جبر اور بربریت کو کمزور کر دیا۔ اس طرح کے حالات ابھی جاری تھے کہ اورنگزیب بادشاہ کے بھائی دارہ شکوہ کو مخدوم بلاول کی علمی فضیلت، عوامی حمایت اور علماء میں ممتاز حیثیت کا علم ہوا۔ چنانچہ وضلع دادو (سندھ) میں مخدوم صاحب کے گاؤں میں ملاقات کرنے آئے۔ دوران ملاقات علمی بحث و مباحثے ہوئے اور کئی موضوعات پر تبادلہ خیالات کے بعد مغل شہزادے نے مخدوم صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اس بیعت نے ولی کی سیاست کو بدگمان کر دیا اور وہاں مذکورہ ملاقات کو ولی کی حکومت کے خلاف اتحاد تعبیر کیا گیا۔ چنانچہ مخدوم صاحب کے مخالفین، سندھ پر نظریں جمانے والوں اور سندھ کے اقتدار پر قابضین کے درمیان مخدوم صاحب کو صفحہ ہستی سے اس طرح مٹانے کے معاہدے ہوئے کہ اعلیٰ مذہبی اور ہردلعزیز شخصیت ہونے کے باوجود کوئی بھی آپ کی مدد و حمایت نہ کر سکے۔

اسی سازش کے تحت مخدوم صاحب پر کلام پاک کی بے حرمتی کرنے کا الزام لگا کر ہندوستان بھر کے مراعات یافتہ علماء سے عبرتناک سزا دینے کے فتاوے حاصل کیے گئے۔ ان فتوؤں پر عمل اس طرح کیا گیا کہ مخدوم صاحب جیسے عارف، اہل اللہ، اہل علم اور ہر دلعزیز، عوام کو احساس زندگی دے کر مایوسیوں سے نکالنے والی شخصیت کو تیل پیلنے والے کولہوں میں زندہ ڈالا گیا اور ان سے فرمائش کی گئی کہ "اگر وہ حاکم کی اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ کرے تو جان بخشی ہوسکتی ہے۔" آپ نے ایسی ذلت کی زندگی کے بجائے دلیرانہ موت کی خواہش کا اظہار کیا۔ نتیجے میں آپ کو کولہوں میں پلوا کر شہید کیا گیا۔ آپ کی اس شہادت کو سندھی ادب کی مقبول و معروف شاعری بیت میں شامل کر کے اس واقعے کو لازوال سانحہ بنا دیا گیا۔ دور حاضر میں بھی آپ کی شہادت کا ادب کے ہر شعبے میں ذکر ہوتا ہے لیکن شعراء، خصوصا اس سانحے کا، بیت کی ہر شاخ کے ذریعے بھرپور اور مؤثر ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ادب میں آپ کو نڈر، پرعزم، باحوصلہ، بااصول اور بے جگرے سے حالات کا مقابلہ کرنے والے ممتاز شخص کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ سن ۱۵۲۱ع میں پیش آیا۔

مخدوم بلاول کی شہادت کے ایک سال بعد ۱۵۲۲ع میں اس سازش میں شامل ارغون حاکم کا انتقال ہوا۔ یہی شاہ بیگ ارغون تھے، جسے بابر بادشاہ نے قندھار سے نکال باہر کیا تھا اور وہ بلوچستان میں آکر سندھ پر قابض ہونے کی تیاریوں میں مصروف رہا۔ جونہی سندھ میں اس کی سازش کے تحت جام فیروز کی دولہ دریا خان سے جنگ ہوئی اور سپہ سالار کو شہادت ملی، فوج کمزور اور حالات حاکم کے قبضے سے باہر ہوئے، اس نے فورا حملہ کر دیا اور اقتدار حاصل کر لیا۔

جب شاہ بیگ فوت ہوا تو وراثت کے طور پر اقتدار اس کے بیٹے شاہ حسن ارغون کو

ملا۔ وہ بھی ۱۵۵۴ء میں لاولد فوت ہوگیا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی سندھ شمال اور جنوب کی دو ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔ شمالی سندھ میں سلطان محمود کو کلتاش نے چُوڈ کو حاکم بنا کر اور بکھر میں مرکز قائم کیا جبکہ جنوب میں شاہ حسن کے دوسرے امیر مرزا عیسیٰ ترخان نے خود کو حکمران ظاہر کیا اور ٹھٹہ کو مرکز بنایا۔ یہی امیر عیسیٰ ترخان بعد میں سندھ پر قابض ہونے والے ترخان خاندان کی حکومت کا بانی ثابت ہوا۔

سن ۱۵۹۱ء میں اکبر بادشاہ کے وزیر خاص مرزا عبدالرحیم خان خاناں کے ہاتھوں شمالی سندھ فتح ہوکر دلی کے مغل بادشاہ کی سلطنت کا حصہ بنا۔

ارغون اور ترخان دور

ارغون، ترخان اور مغل یہ سب باہر سے آکر سندھ پر قابض بننے والے حکمران تھے۔ انہیں عوامی حمایت حاصل نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنے پاؤں پختہ کرنے کی خاطر جبر، ظلم، تشدد اور خوف وہراس کی پالیسی اپنائی۔ ارغونوں اور ترخانوں کو مؤرخین نے "برصغیر کے سابق حملہ آور ہلاکو اور چنگیز خان سے مشابہ" قرار دیا ہے جبکہ سندھ میں مغل حکمرانوں کو "اہل سندھ کا ناحق خون بہانے والے حکمران" کہا گیا ہے۔ (۴۵)

ان سب نے اپنی حمایت کی خاطر اپنے اپنے ہم زبان (فارسی بولنے والے) علماء سندھ میں درآمد کیے۔ لہٰذا ایران، سمرقند، قندھار، ہرات اور بخارا سے فارسی بولنے والے علماء کو بلا کر سندھ میں مراعات کے ساتھ آباد کیا گیا۔

شکر الٰہی سادات کے مورث اعلیٰ سید شکراللہ، نقوی، النجومی، سادات اور شمسی سادات کے ٹھٹہ میں، ہرات کے "میر کی سادلت" کے جد امجد میر محمود میرک بکھر (سندھ) میں اور موسوی سادات کو سکھر میں آباد کیا گیا۔

مذکورہ علماء کی کوششوں سے اگرچہ قابض حکمرانوں کے اقتدار کو طول ملا لیکن علمی طور پر سندھ کو بڑا فائدہ ہوا اور فارسی علم وادب یا درس وتدریس کو جو فروغ ملا اس کے نتیجے میں سندھ کی سرزمین پر بہت بلند قامت فارسی شعراء، معروف و مشہور مدرس، مؤرخ اور محقق سندھ کی ادبی تاریخ پر چمکتے نظر آئے۔ میر یوسف سمرقندی، مولانا یار محمد ہراتی، دانشور خان، غروری، غیوری، کلیج حیدر، میر ابوالمکارم، میر معصوم بکھری، میر نجم بکھری، مرزا غازی بیگ اور طالب "آملی" کے نام اس دور کے ہمہ جہت تخلیق کاروں کے طور پر فلک علم پر جگمگاتے نظر آتے ہیں۔

اسی زمانے میں سندھ میں اردو شاعری کے لئے زمین ہموار ہوئی اور محمود صابری، محمد سعید رہبر، میر علی جعفر بے نوا، سید فضائل علی بے قید اور محسن الدین شیرازی جیسے بلند مرتبت اردو شعراء کی پذیرائی ہوئی اور شہرت ملی۔ ان سے مقامی لوگوں کے تعلقات بڑھے اور سندھی شعراء نے بھی اردو شاعری شروع کی۔ نقادوں نے اس وقت سندھ میں ہونے والی اس شاعری کو ولی دکنی کی شاعری کے مشابہ بیان کیا ہے۔

مجموعی طور پر درج ذیل تصانیف اسی عہد کی سندھ میں سندھی علماء کی تخلیق ہیں جن کا نہ صرف سندھ بلکہ پوری اسلامی تاریخ پر بھرپور اثر ہے اور جنہیں ہر جگہ حوالے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:

میر معصوم بکھری سندھی تاریخ بعنوان تاریخ معصومی، سید عبدالقادر ٹھٹوی کی حدیقہ الاولیاء، (جس میں سندھ کے ۴۴ ممتاز علماء اور روحانی پیشواؤں کا تذکرہ موجود ہے)، بیگلار نامہ تو ہے ہی ارغون اور ترخان دور کی سندھی تاریخ، اسی طرح تاریخ طاہری کا بھی مذکورہ خاندانوں سے تعلق ہے، جس کے مؤرخ میر طاہر محمد نسیانی ہیں۔ میرک یوسف بن میر ابوالقاسم "نمکین" نے جو تاریخ مظہر شاہجانی کے نام سے ۱۶۳۴ع میں لکھی ہے،

اس سے پورے عہد کے ان تمام حکمرانوں سے عوام کی نفرت و حقارت کے اسباب و حقائق اور اہل سندھ کے درد و الم کے قصے پڑھ کر ان سے ہمدردی کا جذبہ بڑھ جاتا ہے۔

اسی عہد یعنی سن ۱۶۶۴ء میں ترخان نامہ لکھی گئی اور محمد رضا بن عبدالواسع نے ۱۶۳۸ء میں شاہ کریم (Sh. Karim) کی سوانح حیات اور شاعری کی ملفوظات کو "بیان العارفین" کا عنوان دے کر تصنیف کیا۔

دراصل ان تاریخوں، تصانیف اور تذکروں کی مدد سے ہی یہ معلوم ہوسکا ہے کہ مذکورہ دور کس قدر زور، زبر، جبر، قہر اور ظلم کی داستانوں سے لبریز ہے۔ بیرونی تسلط کے اس دور میں فارسی میں عبارت ہونی والی ان داستانوں سے واقعات و حادثات کا پتہ تو چل جاتا ہے لیکن سندھی میں اتنی خاموشی ملتی ہے جیسے اہل علم کی زبان بندی کی گئی ہو۔ ان کے ہاتھ سے قلم لے کر توڑ دیے گئے ہوں اور ان کے سوچنے اور اظہار کرنے کی قوتیں صلب کرلی گئی ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ تصوف وغیرہ جیسے بے ضرر ادب کی علامات اور نشان تو مل جاتے ہیں لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ کس شاعر نے عوامی اظہار کے طور پر کس طرح شاعری کی اور کس مصنف نے اپنی تصنیف میں حالات و واقعات کا کس انداز سے اظہار کیا

البتہ "تذکرۃ الابرار" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ "دادو ضلع کے قصبے پاٹر" کے جو بزرگان ترک وطن پر مجبور ہوکر "برھانپور" چلے گئے تھے، انہوں نے حب الوطنی کا نسلوں تک اظہار اس طرح کیا کہ وہ گھروں میں سندھی بولتے اور اپنی وابستگی کے اظہار کے طور پر سندھی شاعری خصوصا کافی اور بیت گا کر سنایا کرتے تھے۔ ان میں سے لاڈجیئو (Jee-o) کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ "کافی گانے میں مہارت رکھتا تھا اور خود بھی شاعر تھا۔" لیکن ان کی بھی سندھی شاعری دستیاب نہیں ہوسکی۔ سندھی کافی اس قدر

مقبول ہوئی کہ پنجاب کے شاہ حسین نے بھی یہی انداز اختیار کیا۔

ہاں البتہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے ظلم و بربریت کی زمانے نے لوگوں کو متح
کردیا اور انہوں نے خود حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی خاطر جانبازوں کے جتھے تیار کیے ج
اپنے عوام کو سکون، مال مویشی کی نگہداشت، شہروں، گاؤں اور قصبوں کی حفاظت
باغوں، کھیتوں اور کھلیانوں کی سنبھال کرنے لگے۔ ان مختلف جتھوں کی متفقہ اور متحد
کمان جمال نامی نوجوان کے ہاتھ میں تھی، جس نے تہام سرگرمیوں کا رخ صرف اور صرف
حب الوطنی کی طرف موڑ دیا جس پر عمل شروع ہوتے ہیں لوگوں کو تحفظ کا احساس ہوا۔ امن
و امان اور سکھ چین کی فضا لوٹ آئی۔ ان حالات نے جمال کو ہیرو بنایا اور ان کے نام کا
"ہوجمال" گیت کا جنم ہوا جو بعد میں تبدیل ہوکر "ہوجمالو" بن گیا۔

یہ تبدیلی نام تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ مصرعوں کی تعداد اور مضمون میں وسعت
اور مفہوم میں کشادگی کا باعث بھی بنی۔ "ہوجمالو" کی موجودہ صورت میں "سکھر واری
پل تے" کا جو مصرعہ موجود ہے وہ بیسویں صدی عسوی کا ہے اور اس زمانے کی نشاندہی
کرتا ہے جب انگریزوں نے دریائے سندھ پر سکھر کے پاس لنسڈاؤن کی فولادی پل تعمیر
کرکے سندھو دریا کے دونوں کناروں سے گزرنے والی قومی شاہراہوں کے باہمی میلاپ کی
تدبیر کی۔ ریلوے کو کوئٹہ اور کوئٹہ سے روہڑی کی لائین استعمال کرنے کی سہولت میسر
آئی۔ سکھر بیراج تعمیر ہوا، جس سے لاکھوں ایکڑ بارانی اور بنجر زمین سیراب ہورہی ہے۔
دریا کے مغربی اور مشرقی اطراف کے اضلاع کے درمیان واقع فاصلے کم ہوئے اور لوگوں کو
آزادانہ سفر کی سہولتیں میسر آئیں۔ نیز اس پل کی تعمیر سے سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ ملک
میں سیاسی، سماجی اور معاشی خوشحالی کا سبب پیدا ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ پل کو ملکی ترقی کی
ضمانت سمجھتے ہوئے اس کے متعلق مذکورہ گیت میں یہ مصرعہ شامل کیا گیا۔

ہر دور نے ثابت کیا ہے کہ ملک کوئی بھی ہو اور زبان کوئی بھی بولی جاتی ہو لیکن وہاں کا شاعر سب سے پہلے ترقی و خوشحالی یا بدحالی اور پسماندگی کو محسوس کرتا ہے۔ اس کی عکاسی ہمیں اس وقت نظر آتی ہے جب سندھ ارغونوں اور ترخانوں کے زیر تسلط تھا۔ اگرچہ اس دور کا سندھی ادب کافی قلیل مقدار میں ملا ہے لیکن اس میں جو آہیں، سسکیاں، چیخ و پکار اور واویلا کیا گیا ہے وہی عکس ہے اپنے عہد کا۔

تاریخ بھی تبدیلیوں کی عکاسی کرتی ہے لیکن وہ پھر بھی مصلحتوں کا شکار ہوجاتی ہے لیکن ادب ہر حال میں اپنا اصل حلیہ برقرار رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔

ڈاکٹر این میری شمل ایک جگہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ "یہ بات انتہائی حیران کن ہے کہ اہل سندھ ہر قسم کی گجھارت اور پہیلی اس قدر پسند کیوں کرتے ہیں۔ نہ صرف گجھارت بلکہ پہلی ڈور اور۔ ڈٹھ بھی ان کی دلپذیر شعری صنف ہے۔ جواب یہ ہے کہ" (۴۶)

جو باتیں اشاروں کنایوں میں کی گئی ہوں، انہیں سندھی میں گجھارت کہا جاتا ہے۔ گجھ کا مطلب ہے ہی راز۔ گجھارتوں میں ادبی، ثقافتی اور سیاسی راز و رموز کو مخفی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا ہر نکتہ ذو معنی ہوتا ہے اور یہ صنف جن نکات پر مشتمل ہوتی ہے وہ تاریخی، سیاسی، اور ثقافتی اہمیت کی بھی ہوتی ہیں۔ اس قسم کے مخفی منظومات کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ ان کا تعلق تاریخ کے وسطی دور سے ہوگا۔ (۴۷) "ڈور" بھی راز و رموز کو ابہام کے ذریعے بیت کے انداز میں منظوم کرنے والی شعری صنف ہے۔ چونکہ بیرونی قابض حکمرانوں کے زمانے میں قدم قدم پر جاسوسی کا جال بچھایا گیا تھا، اور ہر آدمی دوسرے کو مشکوک لگ رہا تھا اس لیے اہم اور آسان بات کو مبہم و مربوط کر کے مذکورہ اصناف کو فروغ دیا گیا۔

اگرچہ ہمیں امیر خسرو کی پہیلیاں اور معے بھی ملتے ہیں، لیکن سندھی سماج میں گجھارت معمہ، پرولی اور ڈور وغیرہ کے اصناف سخن، تفریح طبع کے لئے نہیں بلکہ مخصوص پیغام کو مبہم انداز میں اسی شخص تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے جس کا لغوی ذخیرہ وسیع ہو، ذہانت زیادہ ہو، ریتوں اور رسموں سے باخبر ہو اور معانی پر مہارت رکھتا ہو۔ (۴۸) چنانچہ اسی ارغون، ترخان اور مغل دور میں جب لوگوں کو زندگی گزارنا مشکل محسوس ہوئی تو انہوں نے اپنی بات اپنے ہمرازوں سے اشاروں، کنایوں، استعاروں، پرولیوں، معموں، گجھارتوں، ڈٹھوں، اور ڈور کے ذریعے بیان کی۔ یہ تمام اصناف مذکورہ عہد میں اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہیں۔

سکھوں کے گرو، گرو نانک اسی عہد میں سندھ آئے تھے۔ آپ کی مشہور کتاب گرنتھ صاحب میں آپ سے ایک سندھی بیت بھی منسوب ملا ہے جس کا ترجمہ کچھ یہ بنتا ہے:

"میں تلاش کر کر کے یار کو تھک چکا، مگر پیاس پھر بھی نہ بجھی، دیدار پھر بھی نہ ہوا۔ نانک! وہ آنکھیں ہی غالبا اور ہوں گی، جن سے یار کا دیدار ہوسکتا ہوگا۔"

پیر محمد لکھوی (تحصیل سکھر پ ۱۵۹۰ع) اصل میں ان کا تعلق ٹھٹہ سے تھا لیکن بعد میں تحصیل سکھر کے علاقے لکھی میں آکر آباد ہوئے۔ آپ کی ایک نظم دستیاب ہوئی ہے جس میں نسیم سحر کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں اپنی باریابی کی اجازت طلب کرنے کا پیغام دے کر بھیجا جارہا ہے۔ اس نظم کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

"اے نسیم سحر! تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ اقدس کے سامنے عاجزانہ انداز میں جانا، حاضر ہوکر میری یہ التجا پہنچانا کہ "پیرو ولد ہارون اور الیاس کا پوتہ، سندھی اور سندھ کا باشندہ ہے۔ نہ معلوم یہ آپ کی خاک پا کے برابر ہے کہ نہیں لیکن آپ کے در

اقدس پر حاضری چاہتا ہے۔ آپ کے عشق میں غرق رہتا ہے اور آنا چاہتا ہے لیکن قسمت نے قید کر رکھا ہے۔ "اے نسیم سحر! جا تیز تیز جا، راستے میں کہیں نہ رکنا، وقفہ نہ کرنا، میری یہ التجا۔۔۔۔۔"

بالا سندھ کے ولی اللہ، صاحب کرامت اور اہل اللہ مخدوم نوح ولد نعمت اللہ (جن کا سلسلہ نسب آگے جا کر صدیق اکبر سے ملتا ہے) کی ولادت ۹۱۱ھ کے مطابق ۱۵۰۶ع اور وفات سن ۹۹۸ھ کے مطابق ۱۵۹۰ع ہے۔ وہ واحد سندھی شاعر ہیں جن کا فارسی ملفوظات میں ایسا سندھی بیت ملا ہے جس سے ارغون دور کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور تاریخ کے تاریک حالات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ آپ کا سندھی شعر ہے:

پُسی جا پر بھات سا، ماک نا ھے مانھوؤ
روئی چڑھے رات ڈسی ڈکھوین کی (۴۹)

اس شعر کا اردو ترجمہ درج ذیل دیا جاتا ہے:

"لوگو! رات کی نمی دیکھ کر تم جسے (اوس) شبنم کے قطرے سمجھتے ہو، دراصل وہ رات کے آنسو ہیں۔ دیوانی رات بھی دردمندوں کو کرب میں مبتلا دیکھ کر آنسوں بہاتی ہے۔

سہروردی فکر کے اس صاحب علم و عرفان، ولی اللہ اور بلند پایہ شاعر (جسے اہل سندھ سرور نوح کہتے ہیں) کے متعلق ایک روایت بھی مشہور ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے دروازے پر کسی سائل نے آکر منظوم صدا کی کہ "سمہ جام آئے، عالم سبھ جو آتھیو۔"
(سمہ جام کے آنے سے سارے عالم کو درد والم سے نجات مل گئی۔)

جسے سن کر آپ نے جواب بھی منظوم دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ:

"سمہ جام بیشک سارے عالم کے ہمراہ ہے لیکن تو اس مغالطے میں مت رہنا کہ جام صرف تمہاری نجات کے لئے آیا ہے اس لئے تو بھی اپنا بھرم رکھ اور کچھ کر۔"

علمی فضیلت آپ کی یہ ہے آپ نے کلام پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا (۵۰) اور اس سے سرزمین سندھ کو سعادت ملی کہ سارے عالم میں اس دھرتی کے ہی ایک عالم نے فارسی میں بھی کلام الٰہی کا ترجمہ کیا۔ اگرچہ شاہ ولی اللہ ولد شیخ عبدالرحیم (پ۱۷۰۳ع وفات ۱۷۶۵ع) (۵۱) کے بارے میں بھی شواہد ملتے ہیں کہ آپ نے بھی قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا لیکن پیدائش و وفات کے اعتبار سے سرور نوح اور شاہ ولی اللہ کے درمیان تقریباً دو صدیوں کا فرق ہے۔

لطف اللہ قادری (۱۶۱۱ع-۱۶۷۳ع) بھی ادبی دور کے اعتبار سے سرور نوح کے عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ بھی بہت بلند پایہ شاعر اور عالم فاضل تھے۔ آپ کو سندھی کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی پر بھی مکمل عبور تھا۔ "منہاج المعرفت" اور "تحفتہ السالکین" آپ کی عربی تصانیف ہیں۔ آپ سندھی کے بھی ممتاز شاعر تھے۔ (۵۲) آپ کے مجموعہ کلام کا نام "لطف اللہ قادری جو کلام" ہے۔ آپ کی پسندیدہ صنف شاعری تھی۔ اپنی شاعری کو انہوں نے ۱۹ سروں میں سے ہم آہنگ کیا ہے جو کہ آپ کی موسیقی سے واقفیت کا ثبوت ہے۔ مسلک آپ کا قادری اور موضوع آپ کا تصوف ہے۔

شاہ عبدالکریم بلڑی والے (۱۵۳۶ع-۱۶۲۳ع) کا زمانہ بھی لطف اللہ قادری والا ہی ہے۔ آپ اپنی تخلیقی معیار اور مواد کے حساب سے اولین شاعر ہیں جن کا باقی شعراء کے مقابلے میں زیادہ کلام ملتا ہے۔ آپ بھی بیت کے شاعر ہیں اور توحید کے ساتھ ساتھ تصوف میں وحدت الوجود آپ کی شاعری کے محور ہیں۔ آپ کی شاعری سماع کی محفلوں کی جان تھی۔ شاہ کریم خود بھی جوانی سے لے کر سماع میں شامل ہوتے تھے اور ایک روایت کے مطابق آپ سماع کی محفلوں کو سوز اور درد پیدا کرنے کا اہم ذریعہ گردانتے تھے اور دوران محفل اگر کوئی قوال آپ کو زیادہ متاثر کر دیتا تھا تو اسے انعام و اکرام بھی دیتے تھے۔

آپ کے کلام اور اقوال و اعمال کو تحریری صورت دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں میاں محمد رضا پہلے شخص ہیں جنہوں نے مذکورہ مسودے کا نام "بیان العارفین فی تنبیہ الغافلین" لکھا ہے۔ اس مسودے میں نہ صرف شاہ کریم کا بلکہ وہ کلام بھی جمع کیا گیا ہے جو سید صاحب کی شمولیت والی سماع کی محافل میں پڑھا گیا تھا۔

آپ کا شعری کلام بعد میں تشریح اور تفصیل کے ساتھ ڈاکٹر علامہ دائود پوتا نے "شاہ کریم جو کلام" کے عنوان سے شائع کرایا ہے۔ شاعری میں آپ نے اپنی محبوبیت سے سرشار زندگی کی طرح لہجہ بھی بہت ہی ملائم اور انتہائی نرم اختیار کیا ہے۔ آپ کے کلام میں مولانا جلال الدین رومی کی مثنویوں کا مزاج و میلان شامل نظر آتا ہے۔ آپ کے کلام سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے جسے اردو میں املا لکھا جاسکتا تھا:

توں چئہ اللہ ہیکڑو، وائی بی م سکھ
سچو حرف من میں، سوئی لکھیو لکھ (۵۴)

ترجمہ: کہو اللہ ایک ہے، اس کے علاوہ کوئی فقر بھی نہ سیکھو، یہی حرف سچا ہے، اسی کا ورد کرو اور لکھتے رہو۔

آپ نے بعض سندھی داستانوں کو بھی اپنی شاعری میں علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ درج ذیل شعر دیا جارہا ہے جس کا پس منظر عمر مارئی کی داستان ہے:

عمر! اچھا کپڑا، کانیاریوں کیئں کہی؟
جن جا تھر میں ور تھاوین سہن (۵۵)

ترجمہ: اے عمر! تم نے مجھے اغوا کر کے اور پھر قید میں رکھ کر عیب دار بنادیا ہے۔ میں بھلا اب سفید لباس کس طرح پہن سکتی ہوں؟ میرے ہم وطنوں اور عزیزوں کو لوگ میری وجہ

سے طعنے دیتے ہوں گے۔

ایک لحاظ سے عثمان احسانی (تولد ۱۷۴۰ء) کو بھی آپ کا ہم عصر کہا جاسکتا ہے۔ احسانی مرحوم کی پیدائش اس وقت کے بلوچستان کے علاقے بھاگناڑی میں ہوئی۔ (اس زمانے میں یہ علاقہ سندھ کا حصہ تھا) بعد میں آپ نے اس علاقے کو چھوڑ کر "لکھی" (سندھ) میں آکر سکونت اختیار کی۔ آپ بھی تصوف میں وحدت الوجودی تصور کے قائل تھے۔ آپ اپنے افکار اور اشعار کی بدولت اپنے زمانے کے بہترین شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ شعری ساخت کے اعتبار سے آپ بھی بیت میں اپنا مدعا و مقصد بیان کرتے رہے ہیں۔ آپ کے مجموع کلام کو ابھی جمع ہونا باقی ہے تاہم "وطن نامہ" آپ کی گراں قدر تصنیف کے طور پر موجود ہے۔

غرضیکہ سال ۱۳۵۱ء سے لے کر تقریباً سن ۱۷۰۰ء تک تاریخ سندھ کے اس وسیع عہد نے تین چار حکمرانیاں دیکھیں۔ پہلی سرکار "سمہ حاکموں" کی تھی جس کا سال ۱۳۵۰ء سے آغاز اور ۱۵۲۰ء میں اختتام ہوا۔ ان حکمرانوں کے زمانے میں سب نے مل کی ملکی سلامتی اور خود مختاری کا دفاع کیا۔ اس دفاع میں "راجا اور پرجا" بلکل متفق اور متحد رہے۔ جس کے نتیجے میں بیرونی قوتوں کی شہ پر اندرون وطن کوئی سازش کامیاب نہ ہوسکی۔ ملکی سرحدوں کا دفاع بھی مشترکہ قوتوں کی طور پر ہورہا تھا۔ عوام کو اپنی افواج پر مکمل اعتماد تھا اور ملکی انتظامیہ یا افواج کو اپنے عوام پر پورا پورا بھروسہ تھا جس کی وجہ سے ملک ہر قسم کے حملوں سے محفوظ رہا۔

طرفین کی اس اعتماد اور اعتبار کی صورتحال نے ایک دوسرے کے درمیان اخوت، اتحاد اور اتفاق کے جس جذبے کو جنم دیا اس کے پیش نظر کینہ پرور، عناد پرست، حاسد، حقارت و نفرت کی حامی قوتیں اور ملکی سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام

رہیں۔

چنانچہ ان ایام میں معاشرے سے اونچ نیچ، ذات پات، منافرت اور تفرقہ بازی کا خاتمہ ہوا۔ امن و امان اور عدل و انصاف کی ٹھنڈی چھاؤں بغیر کسی طبقاتی فرق یا اثر و رسوخ کے ہر ایک کو میسر تھی۔ ان حالات میں تعمیر و ترقی میں اضافہ ہوا اور ہر طرف امن و سکون کی فضا قائم تھی۔

ایسے ہی حالات خوشی و شادمانی کا سامان مہیا کرتے ہیں اور لوگوں کی مسرتوں کا اظہار گیتوں کے ذریعے ہونے لگتا ہے۔ سندھ میں لوک گیتوں کی ان گنت اصناف ہیں جن کی زر تذکرہ دور میں تخلیق ہوئی۔ ایسے گیتوں میں ساون، سارنگ اور وسکارے کے گیتوں کے علاوہ کانگڑو، سوت کاتنے والیوں کے گیت "کاپائتی" ہنرمندوں، کاریگروں، فنکاروں، محنت مزدوری کرنے والے کاسہیوں کے گیت، کسانوں کا ہرچو اور اس کے علاوہ شادی بیاہ کی گیچ، منتیں ماننے اور منتیں لے جانے کے گیتوں کے علاوہ بچے کی پیدائش سے لے کر انسانی زندگی میں آنے والی ہر خوشی کے موقع اور مناسبت سے اتنے گیت تخلیق ہوئے کہ ان کی اصناف اور تعداد کا شمار کیا ہی نہیں جاسکتا۔

ان اصناف میں زیادہ تر اصناف اس قدر مقبول و مشہور ہوئیں کہ سندھ سے ملحقہ ہندوستان کے بعض دیگر علاقوں میں بھی نہ صرف پسند ہوئیں بلکہ رائج بھی رہیں۔ (۵۶)

قادر مطلق سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی منظوم التجائیں بھی اسی عرصے میں تخلیق ہوئیں۔ سندھی ادب کی ایک متبرک صنف "مولود" بھی انہی ایام کی تخلیق ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے لے کر پوری زندگی کا احوال سمو دیا جاتا ہے۔ اس میں معراج اور ہجرت کے اہم تاریخی واقعات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مسل نے اپنے مطالعے کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ "سندھ میں دیگر اسلامی

مالک کی طرح محض مخصوص مواقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعلق شاعری نہیں ہوتی بلکہ مذکورہ "مولود" کی صنف وہ ہے جسے بچے کی پیدائش کی خوشی سے لے کر کسی کی وفات کے الم ناک موقع تک پڑھا (گایا) جاتا ہے۔" (۵۷)

سندھی ادب میں ایک اور مخصوص صنف "مناجاتوں ئین مداحوں: بھی رائج ہے جس میں اس کائنات کے تخلیق کار، مالک حقیقی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اور مراتب کا بیان ہوتا تھا لیکن اب سندھی شعراء اس میں کلام الٰہی اور دین اسلام کے اہم نکات کی وضاحت بھی کرلیتے ہیں۔

علاوہ ازیں سندھی شعراء نے اسلامی سال کے بارہ مہینوں کو بھی اس طرح شاعری میں شامل کیا ہے کہ جس مہینے، تاریخ اور مذہب سے کوئی واقعہ منسوب ہے، اسے اسی مناسبت سے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً "ماہ محرم" عاشورہ اور ماتم شہدائے کربلا کے لیے مخصوص ہے جبکہ "ربیع الاول" کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت کے حوالے سے اور ربیع الثانی سے حضرت پیران پیر سید عبدالقادر جیلانی کی نسبت ہے۔ ماہ رمضان پوری کائنات کے لیے برکتوں اور نجات کا مہینا گردانا گیا ہے اور "ذی الحج" تو ہے ہی حج کرنے کا مہینہ جس میں ایسے لوگ حج کی سعادت حاصل کرتے ہیں جنہیں رب العزت توفیق دیتا ہے۔ الغرض سارا سال سندھی شاعروں نے عقیدت و احترام کے پیش نظر مذہبی واقعات کے حوالے سے "بارہ ماہ" کو شاعری صنف میں شامل کیا ہے۔

"مناقبا" اور "معجزا" نام کی دو الگ اصناف بھی سندھی زبان کی مذہبی شاعری کیلئے مخصوص ہیں۔ "مناقبا" اس مضمون کے لیے مخصوص ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ولی اللہ کے معجزات اور کرامات کا ذکر ہوتا ہے جبکہ معجزہ تو ہے ہی معجزات کے تذکروں کے لیے مخصوص۔

"ٹریہ اکھری" بھی ایسی ہی شعری صنف کا نام ہے جس میں اللہ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ذکر کیا جاتا ہے اور اسلامی مذہب کے متعلق تصورات اس طرح شامل کیے جاتے ہیں کہ ہر بیت کا آغاز عربی الف ب کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ شاعری تو ہے ہی ناصحانہ مضمون کو منظوم کرنے کیلئے۔

ایک طرف مختلف مواقع کو اس قسم کی شعر و شاعری میں بیان کیا جارہا ہے تو دوسری طرف مذہبی تبلیغ کیلئے بھی یہ زمانہ نہایت مفید اور مناسب ثابت ہوا۔ اسی زمانے میں اسماعیلی مبلغین کی سرگرمیوں کے علاوہ محمد جونپوری کی مہدوی تحریک کو ترقی دینے کی سعی ہوئی، قادری، نقشبندی، چشتی اور سہروردی مکتبہ فکر کے حامی اہل تصوف سب نے شعری پرچار اور تبلیغ کا سہارا لیا۔ اس کی وجہ سے گنان، گاتھائیں، دوہے، سورٹھے، بیت اور کافی کی شعری اصناف کے اندر تصوفانہ مضامین کے ساتھ روحانی رموز اور الٰہیات کا تصور بھی پیش کیا گیا۔ انہی موافق حالات نے ذکر و فکر اور سماع کی محافل کا رواج عام کرنے میں مدد دی جس کی وجہ سے دائرہ اسلام روز بروز وسیع ہوتا چلا گیا۔

بیت کی شاعری کو تو اس زمانے میں زیادہ فروغ ملا جس کی وجہ سے یہ صنف واقعاتی بیت اور نژبیت کے روپ میں مزید مؤثر ہوئی۔ ملکی امن و خوشحالی کے باعث گجرات، کچھ، کاٹھیاواڑ، راجستھان، ملتان، بہاولپور، بلوچستان، لسبیلا اور مکران وغیرہ کے عوام سے عزیزانہ، دوستانہ اور برادرانہ مراسم میں مزید اضافہ ہوا۔ جس سے ان علاقوں میں نہ صرف سندھی زبان کو ترقی کرنے میں آسانی ہوئی بلکہ سندھی شاعری بھی سندھ سے ملحق مذکور بالا علاقوں میں مقبول ہوئی۔

تعلقات اور مراسم دوستانہ ہونے کی وجہ سے سندھی راگیوں نے سندھ کی رومانوی داستانوں کو بھی سندھ سے باہر پہنچایا اور یہی داستانیں ہوبہو سندھی راگوں اور دھنوں

سمیت ان علاقوں کے راگیوں نے سیکھیں اور انہیں آگے بڑھایا جس سے سندھ کی تمثیلی شاعری کو وسعت ملی۔

سابقہ روایات کے برعکس اس دور کا سندھی شعر زیادہ تر تصوفانہ تصورات، روحانی رموز اور حسن و عشق کے مضامین کے ساتھ ہجر و فراق کے ذکر و فکر سے بھی سرشار ہے۔ اس میں رنگینی اور شگفتگی زیادہ ہے اور یہ اپنے معاشرتی حالات کا عکس لیے ہوئے ہے۔

اس دور میں نعتیہ شاعری اور منظوم انداز میں دنیا کی بے ثباتی کی باتیں اگرچہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات خراب ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو کہ ارغون اور ترخان جیسے حملہ آور قبائل کے روپ میں آکر اقتدار پر قابض رہنے کی وجہ سے تاریخ نے بھی بتائی ہیں۔ تاہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثناء گوئی مستقل طور پر اور پختہ طریقے سے اس دور کی شاعری میں جگہ لے چکی تھی۔ شاعری میں ایک نئی روایت "الف اشباع" کو قافیے کی جگہ استعمال کرنے کی بھی ریت ڈالی گئی۔ اس روایت کے مطابق کسی مصرعے کے قافیے میں "آ" آ چکا ہے اور دوسرے میں جواب، ثواب، خواب یا ایسا کوئی دوسرا لفظ آیا ہے جس میں "آ" شامل نہیں تو اسے جوابا، ثوابا اور کتابا شتابا وغیرہ بھی بنایا جاتا تھا۔ اس قسم کی شاعری کو تخلیق کار کی "سندھی" بھی کہا جاتا تھا۔ "کبت" یا "طویل بیت" کی ریت کے علاوہ "کیرت" یا ہجو نگاری اور پہیلیں گوئی کا منظوم انداز بھی اسی دور کی ادبی تاریخ کا حصہ بنا ہے۔

کلام پاک کا فارسی ترجمہ بھی سندھ کے اہل علم نے اسی عہد میں کیا تھا۔ قاضی قاضن، لطف اللہ قادری اور شاہ کریم جیسے پختہ شعراء کے مجموعہ ہائے کلام بھی اگرچہ اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں توحید اور خالصتا تصوف کے موضوعات پر خیال آرائی کی گئی ہے لیکن ان میں سماجی ناانصافیوں، سیاسی سطح کی ناہمواریوں اور عوام کے حالات

کی طرف کوئی واضح اشارہ نظر نہیں آتا۔ حالانکہ اس کی تاریخ، سندھ کے اقتدار پر قابض ارغونوں اور ترخانوں کے ریاستی تشدد اور قہری کارروائیوں سے بھری پڑی ہے لیکن ادب میں ایسی کوئی نمایاں علامت نہیں ملتی ماسوائے مخدوم نوح کی شاعری کے جو مذکورہ بالا شعر حادثاتی طور پر فارسی میں لکھے ہیں۔ بیاض میں پوشیدہ رہ گیا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ مغلوں سمیت اغیار کے مذکورہ تینوں خاندان جب تک اقتدار میں رہے اس دوران سندھ میں قنوطیت کا غلبہ رہا اور ملک غیر یقینی صورتحال، مایوسی، اور نا امیدی کی کیفیت میں ڈوبا رہا۔ ان حالات نے قوم میں اتحاد و اتفاق پیدا کیا، وطن اور وطن کی مٹی سے پیار اور حب وطن کے جذبات کو تقویت پہنچائی۔ اس صورتحال کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ادب میں جن لوگوں نے وطن پر جان نثار کی، دلیری دکھائی اور حشمت و شجاعت کا مظاہرہ کیا اسے عوامی شاعری بیت اور لوک اصناف میں اس طرح پیش کیا گیا کہ وہ خود ہی تاریخ کا مستند حصہ بن گئی۔

تاریخ نے اس راز کو بھی افشاں کیا ہے کہ ارغونوں، ترخانوں اور مغلوں کے دور (۱۵۲۱ع-۱۷۱۸ع) میں جو فارسی بولنے والے علماء و فضلاء سندھ میں مختلف مقامات پر آباد کیے گئے تھے، ان کی دوسری نسل خالصتاً سندھی بن کر ابھری اور اس نے نہ صرف اپنے ہم وطنوں کے سانہ بشانہ ملکی سلامتی اور خودمختاری کے لیے سرگرمی سے کام کیا بلکہ انہوں نے سندھی زبان کو مادری زبان پر فوقیت دی، سندھی ادب کے لیے نئے نئے موضوعات اور مضامین پر مشتمل سندھی اور فارسی تصانیف تخلیق کیں اور انہوں نے فارسی کتابوں میں سندھی حاشیے لگائے۔

شاہ عبیت رضوی ولد شاہ نصیرالدین (پ ۱۰۳۰ھ، وفات ۱۱۲۵ھ) (۵۸) کا شمار مذکورہ نسل کے شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کا نہ صرف مکمل مجموعہ کلام دستیاب ہے بلکہ ان

کی شاعری کا بیشتر حصہ تو مسائل تصوف، حسن و عشق اور ہجر و وصل کی کیفیات کا مظہر ہے۔ ان کے کلام میں سندھ کے معاشی اور معاشرتی رخ بھی بڑے نمایاں نظر آتے ہیں۔ آپ جہاں سندھی کے نامور شاعر تھے وہاں سندھی موسیقی پر بھی آپ کو عبور حاصل تھا۔

سید علی (ثانی) شیرازی ٹھٹوی ولد سید جلال بن سید علی (اول) بھی مذکورہ دور میں سندھ آنے والے انجوی شیرازی سادات میں سے تھے۔ انہوں نے چوراسی سال کی عمر میں سن ۱۵۷۲ع میں وفات پائی۔ سماع آپ کا پسندیدہ مشغلہ اور فقراء کی صحبت میں زیادہ وقت صرف کرنا خوشی میں شامل تھا۔ آپ سندھی اور فارسی دونوں زبانوں میں بڑی روانی سے شعر کہتے تھے۔ سندھ کی مشہور رومانوی داستان سسئی پنہوں کے متعلق اشارے کنائیے بھی آپ کی شاعری میں ملتے ہیں۔

قادری مسلک پر کاربند شاہ خیرالدین ولد سید احمد (پ ۱۵۰۵ع وفات ۱۶۱۷ع) کا تعلق اگرچہ بغداد سے تھا لیکن وہاں سے آنے کے بعد سندھ میں تحصیل ہالا (ضلع حیدرآباد) اور بعد میں سکھر میں آکر مستقل سکونت اختیار کی۔ یہیں پر آپ کا مزار شریف بھی موجود ہے۔ اگرچہ آپ مرید مخدوم سرور نوح ہالائی کے تھے لیکن شاہ عنایت رضوی آپ کے بھی بڑے مداح تھے اور ان کے معتقدین میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کا ایک سندھی شعر زیادہ مشہور ہے جو سکھر کے قریب دریائے سندھ میں واقع جزیرہ "سادھ بیلہ" میں ایک عبادت گزار کو یاد الٰہی میں مصروف دیکھ کر آپ کی زبان سے بے ساختہ منظوم ہوا تھا۔

اس زمانے میں کچھ ابیات میں سندھ کے سخی سرداروں کے نام شامل کر کے منظوم کرنے کا بھی رواج تھا۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ زیر تذکرہ دور کے جن سخی سرداروں نے محتاجوں، ضرورت مند اور بے سروسامان لوگوں کی امداد کی، تو جواباً ان بے حال ماں اور بے خانماں لوگوں کے دلوں سے اپنے مددگاروں کے لیے دعائیں اور نیک تمنائیں، صداؤں کے

روپ میں دل سے اٹھ رہی تھیں۔ شاعری میں انہیں شامل کر کے زمانے کے ان ستائے ہوئے لوگوں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا ہوگا۔

سندھ میں اہل تصوف اور اہل اللہ کی تبلیغ اور اصلاحی کوششوں کی وجہ سے مذہبی تفرقہ کو سماجی سطح پر ابھرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ چودھویں صدی عیسوی میں ابھی سمہ دور حکومت جاری تھا کہ "کچھ" میں سمہ قبیلے کی ہی ایک شاخ "جاڑے جا" میں سرداری سلسلہ شروع ہوا جنہوں نے "بھج" کو دارالحکومت بنایا۔ اس طرح "کچھ بھج" میں سندھی ثقافت، سندھی زبان اور تعلیم کا رواج بڑھا۔ اسی زمانے ۱۵۳۹ء میں کاٹھیاواڑ اور ہالا میں ایک نیا شہر "نواں نگر" کے نام سے تعمیر ہوا جہاں سمہ نسل کے سرداروں نے اپنے لیے "جام" کے لقب کا انتخاب کیا اور "نواں نگر" کا نام "جام نگر" میں تبدیل ہو کر مشہور ہوا۔

تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ سولہویں صدی عیسوی میں سندھی زبان اور اس کا اثر "کچھ۔ بھج" سے آگے کاٹھیاواڑ اور ہالار تک پہنچا بلکہ کافی گہرا ہوا۔ اسی زمانے میں کئی سندھی قبائل گجرات اور احمد آباد بڑودے تک گئے جن کے ساتھ سندھی زبان، علم و ادب بھی وہاں پہنچا اور یہاں کے قصے، کہانیاں اور موسیقی اور گائیکی بھی ان علاقوں میں پہلے پسند ہوئی بعد میں اپنالی گئی۔

سن ۱۶۱۸ء میں "جام نگر" کے وزیر اعلیٰ (جسے دیوان کہا جاتا تھا) کیشو ٹھاکر نے سندھی خاتون "دھن بائی" سے شادی کی۔ اس سے بیٹا پیدا ہوا جس کا نام "مہر راج" رکھا۔ یہ بچہ مہر راج، سندھی زبان ماں کی گود سے سیکھ کر جوان ہوا۔ اس کی ذہنی اور دھرمی تربیت سندھ کے ایک سادھو سنت "سامی نجانند" نے کی جس کا پہلا نام "دیوچندر" تھا۔ بعد میں مہر راج اسی "سامی نجانند" کا چیلہ بن گیا۔ اس نے اپنے گرو سے سندھ کے شہروں، سندھ کی کہانیوں میں موجود کرداروں اور تاریخی واقعات کے متعلق سنا اور درویشوں کے

قصے یاد کیے۔

جب سندھی تاجروں کا ایک قافلہ عراق اور بصرہ گیا تو وہاں جاکر عربی سیکھی اور قرآن پاک پڑھا اور ایک اہل اللہ کی صحبت میں وقت گزارنے لگا۔ واپسی ۱۶۵۵ء میں ہوئی تو اپنے گرو کے سرگواس ہونے کی خبر سنی۔ کچھ عرصہ جام نگر میں رہ کر اپنے گرو کی یاد میں "کھے جرا" کے نام سے ایک مندر تعمیر کروایا۔ یہی "مہراج" بعد میں "پرارتھنا" میں گم ہوا اور گرو کے غم میں ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ آخر کار خود بھی "سامی پران ناتھ عرف مہراج" کے نام سے مشہوری حاصل کی اور کئی چیلے تیار کیے۔ ایک ایسے ہی چیلے بھائی لال داس نے ان کی سوانح لکھی۔ سامی مہراج مؤحد (توحید پرست) درویش بنے۔ بڑے شاعر کے طور پر نمایاں ہوئے۔ ان کی کویتائیں ذہنی اور قلبی سکون کی خاطر لوگوں کو ازبر رہنے لگیں۔ ان کی کویتائیوں کا بہت بڑا ذخیرہ آج بھی جام نگر کے لوگوں کے پاس تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے اکیس ہزار کے لگ بھگ اشلوک (ابیات) بھی ملے ہیں جو کہ گجراتی، سندھی، ہندی، (پنجابی) اور اردو (جسے اس وقت ہندوستانی کہا جاتا تھا) میں ہیں۔ انہوں نے اسلامی اثر اس قدر قبول کیا تھا کہ ایک ضخیم کتاب سندھی میں "قیامت نامو" کے نام سے لکھی جس کا اختصار انہوں نے خود ہی عربی میں بھی لکھا۔ انہیں سندھی پر نہ صرف بولنے بلکہ شاعری کرنے کی حد تک عبور تھا۔ سندھی شاعری کا ایک ذخیر "سندھی وانی" کے نام سے دستیاب ہوا ہے۔ "سندھی وانی" شائع شدہ ہے اور خالصتاً سندھی اہل تصوف کے انداز سے شاعری کی گئی ہے۔ یہاں چند اشعار دیے جاتے ہیں جن میں روح کو اپنے خالق سے جدا ہونے کا جو غم اور درد ہے اس کا اظہار کیا گیا ہے:

اے میرے، اور مالک میری روح کے
اب میں کس سے دل کا حال کہوں

میری روح کو آپ نے ہی پردیس بھجوادیا
اب کس سے یہ فریاد کروں"(۵۹)

اس شاعری اور تذکرے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ جب سندھ کے حکمران سمہ، متحد رہے اور ملکی مفادات۔۔۔۔ یا رعایا کا مکمل خیال رکھا تو سلطنت سندھ کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ سندھی ثقافت، زبان، ادب اور شعر و شاعری میں بھی توسیع آئی اور ترقی ہوتی رہی۔ لیکن جب حکومت میں اندرونی انتشار پیدا ہوا اور کمزوری پڑی تو اس کا فائدہ سندھ مخالف قوت اور ارغونوں کو ہوا جنہوں نے فوری طور پر سندھ پر قبضہ کرلیا۔

ارغونوں کے ظلم و بربریت کے خلاف، سندھ کے عوام متحد ہوتے ہی ارغون حکومت کمزور پڑتی چلی گئی۔ اس بات کا پچھلے اوراق میں تفصیل سے ذکر ہوچکا ہے کہ ارغون، سندھ کی اندرونی سازشوں اور نفاق کی اوٹ لے کر اقتدار پر قابض ہوگئے تھے۔ سندھیوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر انہیں ملک سے نکالنے کی کوششیں کیں۔ اس متحدہ جدوجہد کے نتیجے میں ارغون اگرچہ کمزور ہوگئے لیکن اس کمزوری کا فائدہ انہیں کے ہم وطن ترخان خاندان کو ہوا جس نے سندھ کے اقتدار پر قبضہ کروا کر ارغونوں کو ملک سے نکال باہر کرنا چاہا۔ ان حالات نے ارغونوں کو بڑا وطن پرست بنادیا اور وہ ترخانوں کے خلاف پہلے سے برسرپیکار سندھیوں سے مل کر اسی کام میں شامل ہوگئے جو سندھی پہلے ارغونوں کو اور اب ترخانوں کو ملک سے مار بھگانے کیلئے کر رہے تھے۔

لیکن اس بار بھی ان سرفروشانہ سرگرمیوں کا فائدہ مغلوں نے اٹھایا جو سمہ دور سے لے کر گھات لگائے بیٹھے ہوئے تھے اور سندھ پر قبضہ کرنے کے لئے کئی بار حملے کرچکے تھے۔ تاہم اس بار ملک میں جو انتشار پھیلا ہوا تھا، اس نے ملک پر قبضہ کرنا قدرے آسان بنادیا اور وہ سندھ کے دارالخلافہ (ٹھٹھہ) پر قابض ہونے میں کامیاب ہوئے جہاں حکومت

چلانے کیلئے اپنا گورنر مقرر کیا۔

اس صورتحال نے اہل سندھ کو دودھاری شکنجے میں جکڑ لیا جس سے نجات پانے کی پھر سے کوششیں کرنی پڑیں۔ چونکہ ترخان اور مغل دونوں اقتدار پر قابض تھے اس لئے جوابا وہ بھی ہر شخص کو مشکوک ہونے والی ہر میل ملاقات کو اپنے خلاف سازش سے تعبیر کرتے اور سختی سے کچلنا اپنا منصبی فرض گردانتے تھے۔

دوسری طرف کوئی ڈیڑھ صدی قبل جب عبدالرحیم خان خاناں سندھ پر حملہ آور ہوا اور سکھر سے لے کر چانڈکا، شکارپور اور سبی تک کا علاقہ آدم شاہ کلہوڑا جیسے پارسا اور نیکوکار شخص کی دعائیں لے کر فتح کرلیا، تو بعد میں اس نے چانڈکا، اس بزرگ کو جاگیر کے طور پر عنایت کردیا۔ لیکن چند سالوں کے اندر ملتان کے مغل گورنر نے ان پر الزام لگا کر چانڈکا سے اٹھایا، ملتان میں لاکر قید کیا۔ چند ماہ بعد پھانسی دے دی اور لاش ان کے فقیروں، مریدوں اور معتقدین کو سندھ بھیج دی۔ تب سے نہ صرف کلہوڑا بلکہ ان کے زیر اثر لوگ اور اب (ٹھٹھہ پر قبضہ کرنے کی وجہ سے) سندھ کے لوگ مغلوں کو بھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔

سن ۱۶۵۹ء میں اورنگزیب جب اپنے والد شاہجہان کو معزول کرنے کے بعد انہیں جیل بھیج کر دلی میں تخت نشین ہوا تو ان ایام میں ٹھٹھہ پر مغلوں کا قبضہ تھا اور وہاں سندھ میں گورنر کو حاکم مقرر کیا گیا۔ لہٰذا اورنگزیب نے دیکھا کہ سندھ میں ان کی حکومت غیر مستحکم ہے تو گورنر اور پالیسی دونوں تبدیل کیے۔ سخت سے سخت گیر حاکم مقرر کیے اور پالیسی بھی سخت اپنائی۔ اس کے باوجود وہاں استحکام نظر نہیں آرہا تھا اور عوام قابو میں نہیں آرہے تھے۔

اپنی حمایت حاصل کرنے کے لیے انہوں نے جاگیرداروں، نوابوں، سرداروں،

امیروں اور "علماء" کو مراعات دیں، اختیارات دیے، عنایات کیں، خلعتیں عطا کیں اور القابات سے نوازتا کہ ایک مراعات یافت حلقہ تشکیل دیا جائے۔ لیکن مطلوبہ نتائج پھر بھی حاصل نہیں ہو رہے تھے۔ انہوں نے تیرہ سالوں کے اندر ۹ گورنر تبدیل کیے اور ان گورنروں میں سے شاید کسی کو مسلسل دو سال سندھ کا آب و دانہ نصیب ہوا ہوگا۔

زیر تذکرہ عہد میں سندھ نہ صرف سیاسی سطح پر کمزور، معاشی اور معاشرتی سطحوں پر پسماندہ ہوگیا بلکہ وہ سندھ جو سومرا اور سمہ ادوار میں تعلیمی میدان میں جنوب ایشیا میں پیش پیش تھا، فروغ دین میں یہاں کے علماء ہند و عرب میں شہرت پا چکے تھے، علمی، ادبی اور تدریسی شعبوں میں اسے برصغیر میں سبقت حاصل تھی، اب قابل رحم، اور قابل ترس زندگی گزار رہا تھا۔ اس خطہ زمین کی رہی سہی کسر مذہبی تفرقے بازی کی آگ نے پوری کردی تھی۔ اہل سندھ اس الجھن کا شکار ہوگئے کہ کس فرقے کو سچا اور کس فریق کو حق پر سمجھیں۔

وجہ یہ تھی کہ جب فریقین ایک دوسرے سے مناظرہ کرتے تو ایک فرقہ دوسرے کو کاذب، جھوٹا، مکار، دھوکہ باز، جاہل، فریبی، بکاؤمال اور کافر ثابت کرنے کے لیے جو آیات ربانی پڑھتا، احادیث و فقہ کے حوالے دیتا وہی طریقہ دوسرا مکتبہ فکر اپنی باری پر، پہلے فریق کیلئے استعمال کرتا اور اسے غلط ثابت کرنے اور خود کو صراط مستقیم کا پارسا مسافر ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ اس بات کے لیے ہر مکتبہ فکر، بازاری زبان استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔

ایسی صورتحال نے عوام کا علماء پر سے اعتماد ختم کردیا اور وہ مخمصے اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہوگئے۔ تاہم ایک ادبی فائدہ یہ ہوا کہ "مناظرہ بازی" کی اس فضا سے حقیقی معنوں میں "مناظرہ" کی صنعت تخلیق ہوئی جس کے تحت نیکی اور بدی کے مابین

"مناظرہ" منظوم کیا جاتا۔ ہلکے پھلکے انداز میں انتہائی اہم باتیں بیان کی جاتیں، معاشرے کی برائیوں، کمزوریوں اور خرابیوں سے پردہ ہٹایا جاتا اور مسائل کے حل بیان کیے جاتے۔ اس دور میں منظوم ہونے والے مناظرات میں "ملا اور موالی، پگ اور ٹوپی، چلم اور بیڑی" اور اس طرح کے دیگر کرداروں کے درمیان مکالمہ بازی کو کافی شہرت و مقبولیت ملی۔

لیکن حالات لفاظی اور ہدایات کا نہیں عملی اقدام کا تقاضا کر رہے تھے۔ جس کے لیے عوام رہنماؤں اور ایسے پیشواؤں کو تلاش کرنے لگے جو انہیں نہ صرف اغیار سے نجات دلائیں بلکہ حملے بند کرائیں، ملک کو ترقی دلائیں، ان کا حوصلہ بڑھائیں، ہمت بندھائیں اور انفرادی غصے کو یکجا کر کے اجتماعی قوت پیدا کریں اور اسے تعمیر وطن میں صرف کریں۔

کلہوڑا دور

عوام کو اس طرح کی خوبیاں، فقیر طبع اور درویش صفت، پارسائی اور پاکبازی میں مشہور کلہوڑا خاندان میں نظر آئیں۔ لوگ انہیں احتراماً "میاں" کہتے تھے اور جو پہلے سے نہ صرف مغلوں سے ناراض تھے بلکہ آدم شاہ کے خون ناحق کے لیے بھی انہی کو ذمہ دار بنائے ہوئے تھے۔

کلہوڑا قبل ازیں ڈیرہ غازی خان کے علاقے میں مقیم تھے لیکن زیر تذکرہ زمانے میں چانڈکا (لاڑکانہ) میں آکر آباد ہوئے تھے۔ یہاں بھی اس خاندان کے ہر فرد کے گرد معتقدین اور مریدین کا ایک وسیع حلقہ موجود تھا۔ زیر اثر لوگوں کی تعداد تو شمار سے باہر تھی۔ ان کے تکیوں پر، خانقاہوں اور محافل میں ذکر الٰہی کے بڑے بڑے اجتماعات ہوتے جہاں لوگوں کو رنجش بھلا کر آپس میں اخوت و بھائی چارہ قائم کرنے کی تلقین کی جاتی اور نیکی کی طرف رغبت دلائی جاتی اور اتحاد و اتفاق کا درس دیا جاتا۔

عوام ایسے ہی پارسا لوگوں کو مصائب و مشکلات سے نجات دلانے کے لیے کہتے تھے اور

حالات کا رخ بھی انہی کے حق میں تھا۔ چنانچہ سن ۱۷۰۱ء میں کلہوڑا خاندان سندھ میں نیم خود مختار حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے چند سال بعد ۱۷۰۸ء میں انہیں مکمل اقتدار حاصل ہوا اور یہ سال ۱۷۸۲ء تک سندھ میں خود مختار حاکم رہے۔

سندھ کے یہ خود مختار حکمران بھی سومرا اور سمہ حاکموں کی طرح بلکہ ان دونوں کے ناطے، نہ صرف سندھی اور سرائیکی زبانیں بولتے تھے بلکہ ان دونوں زبانوں میں شاعری کرتے اور ادب تخلیق کرتے تھے۔ میاں سرفراز کلہوڑو (۱۷۷۲ء) حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ سندھی اور فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ سندھی میں آپ کی "مناجاتیں" بہت مشہور ہیں۔ علاوہ ازیں آپ فارسی کے بھی بہت بڑے شاعر رہے ہیں۔

کلہوڑا دور میں فارسی علم و ادب کی ترقی میں جن ممتاز علماء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں علامہ محمد معین ٹھٹوی عرف مخدوم ٹھارو (۱۶۸۲ء تا ۱۷۴۸ء) بھی شامل تھے۔ آپ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ فارسی، عربی، سندھی اور ہندی علوم پر آپ کو کافی دسترس حاصل تھی۔ فارسی میں آپ کا تخلص "تسلیم" جبکہ ہندی اور سندھی میں "ویراگی" کے تخلص سے شاعری کرتے تھے۔ عربی میں تصوف، روحانیت اور الٰہیات کے موضوعات پر آپ کی ایک کتاب تو کافی مشہور ہے جس کا عنوان ہے "دراسات اللبیب"۔ یہ کتاب شائع ہوچکی ہے۔

محمد محسن (۱۷۰۹ء تا ۱۷۵۰ء) بھی آپ کے ہمعصر شعراء میں شامل تھے جن کی چھ تصانیف اور ایک "دیوان قصائد" شائع ہوچکے ہیں۔

میر حیدر ابو تراب کامل (وفات ۱۷۵۱ء) کا بھی اسی زمانے کے شعراء اور علماء سے تعلق تھا۔ آپ کے جد امجد وہی فارسی کے ممتاز علمائے دین تھے جنہیں ارغون اور ترخان ادوار میں مراعات دے کر سندھ میں بسایا تھا۔

میر جان اللہ رضوی (وفات ۱۷۵۴ء) بھی فارسی کے بہت بڑے شاعر گذرے ہیں۔ آپ مثنوی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ "ساقی نامہ" آپ کی مشہور مثنوی تھی جو شائع ہوچکی ہے۔ آپ نے قصائد کی شاعری بھی کی ہے۔

میر عبدالرشید تھٹوی (وفات ۱۷۵۶ء) آپ بہت بڑے عالم فاضل تھے۔ شاعری کے علاوہ آپ کی دو لغات کو بھی ابھی تک علمی حلقے میں پذیرائی حاصل ہے۔ ان لغات کے نام "فرہنگ رشیدی" اور "منتخب اللغات" ہیں۔

اس دور میں فارسی علوم اور شاعری دونوں اتنے مقبول تھے کہ ہندو بھی مسلمان علماء اور شعراء سے فارسی علوم آکر پڑھتے اور شاعری سیکھتے رہے۔ ایسے ہندو شعراء میں منشی شیوک رام اور بالچند کو کافی شہرت حاصل رہی۔ منشی شیوک رام محمد محسن کے اچھے شاگردوں میں سے تھے اور ان کا تخلص عطارد تھا۔ عطارد کو فارسی غزل گوئی پر بڑا عبور تھا اور غزل بھی اتنی اچھی لکھتے تھے کہ حافظ شیرازی کی غزل کا شبہ ہوتا تھا۔ (۶۰) آپ پر حافظ شیرازی کا بہت گہرا اثر تھا۔ علاوہ ازیں آپ نے فارسی نثر میں کافی شہرت حاصل کی۔ ہیر رانجھا کا مشہور عشقیہ قصہ آپ نے فارسی نثر میں تصنیف کیا۔ آپ کو فارسی میں انشاء پردازی پر تو کمال حاصل تھا۔ "انشائے عطارد" آپ کی اس ضمن میں مشہور تصنیف ہے۔

چندر بھان حقہ بھی فارسی ادب کی ترقی کے مذکورہ دور سے وابستہ تھے۔ آپ کا تخلق "اعجاز" تھا اور انہیں اعلیٰ پایہ کا شاعر مانا جاتا تھا۔ آپ کے شعر کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

از وطن آوارہ چوں یوسف زاخوان گشتہ ام،
کاش لطفِ حق زلیخاسا خریداری کند (۶۱)

حاجی محمد رضائی بھی اسی عہد کے تھے جنہوں نے "زیبا نگار" کے نام سے سندھ کی

مشہور نیم تاریخی داستان "سسئی پنہوں" کو فارسی میں پیش کیا۔ اس دور کے دیگر اہم علماء اور شعراء میں ملا عبدالحکیم عطا، میر لطف علی خان "ہمت"، میر ابوالبقاء، شیخ محمد محفوظ، قمرالدین عشرت، غلام علی مومن اور حسن بخش اظہر وغیرہ شامل تھے لیکن جو اعلیٰ حیثیت علی شیر قانع کو حاصل تھی وہ شاید ہی کسی کو ملی ہوگی۔

میر علی شیر قانع (۱۷۴۷ء تا ۱۷۸۹ء) فارسی میں ایک بسیار گو شاعر ہی نہیں بلکہ مؤرخ و محقق بھی تھے۔ آپ عزت اللہ کے فرزند تھے جن کا تعلق ارغون دور میں سندھ آنے والے شکر الٰہی سادات سے تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مخدوم محمد معین الدین اور مخدوم رحمت اللہ سے حاصل کی جبکہ فارسی میں عبدالحسن آپ کے استاد تھے۔ آپ نے ۱۲ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔ آپ ابتداء میں اپنا تخلص "مظہری" کرتے تھے لیکن بعد میں "قانع" سے شاعری کی اور یہی تخلص زیادہ مشہور ہوا۔ تیس کے قریب آپ کی تصانیف ہیں، جن میں "مقالات الشعراء" بہت اہم ہے۔ ان مقالات میں آپ نے سندھ کے ۱۷۹ اہم شعراء کا تذکرہ کیا ہے۔ دیگر مشہور کتب میں "مکلی نامہ" اور "تحفۃ الکرام" بھی شامل ہیں جنہیں سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد نے پیر حسام الدین راشدی جیسی عظیم علمی ہستی کی تصحیح اور حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے۔

اگرچہ مذکورہ بالا تذکرے سے اس وقت کے فارسی علم و ادب کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے لیکن یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ کلہوڑا فارسی کے علاوہ سندھی اور سرائیکی شعراء اور ادیبوں اور عالموں کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے اور خوب قدردانی کیا کرتے تھے جس کے باعث سندھی زبان کو نئی زندگی ملی۔ شعر و ادب میں نئی جان آئی اور سندھی علم و ادب شعری میدان کے علاوہ نثری شعبوں میں بھی نمایاں نظر آنے لگا۔ البتہ اس عہد کے سندھی ادب پر وقت کی سیاہ رات کا بہت گہرا سایہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان ایام میں بیرونی

سازشیں بھی جاری رہیں اور بیرونی حملے بھی برقرار رہے۔

ایران کے ایک فرد امام قلی کا بیٹا نادر قلی جو بعد میں نادر شاہ کے نام سے بادشاہ بنا (اور جسے تاریخ اس کی سفاکانہ، سنگدلانہ، ظالمانہ اور انسانیت سوز سرگرمیوں کی وجہ سے اچھے نام سے یاد نہیں رکھتی) نے سندھ پر حملہ کیا اور اپنے ہی حملے کا سندھ سے تاوان طلب کیا۔ کلہوڑا حکمرانوں نے سندھ کو اس قہری کاروائیوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر سندھ کے علاقے سبی اور شکارپور اس کے حوالے کیے۔

اسی عہد میں احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا اور مدد خان پٹھان نے لوٹ مار کی، بارونق شہروں کو جلایا، باغات اجاڑے، کھیتوں اور کھلیانوں کو آگ لگائی اور اتنی ظالمانہ کاروائیاں کیں کہ یہ کہاوت مشہور ہوئی کہ "کونسا تیرے پیچھے مدد پڑا ہے"۔ (کھڑو پٹھیاں پیو تھئی؟)

اس طرح تاریخ میں نہ صرف بیرونی حملوں کا بیان ملتا ہے بلکہ یہ بھی احوال ملتا ہے کہ تھر کے علاقے میں سوڈھا قبیلے نے شورش بپا کی اور خوب لوٹ مار مچائی۔ خور کلہوڑا حکمرانوں کے لشکر میں جو جانباز اور سرفروش فوجیوں کے طور پر تالپور شامل تھے، آخری دنوں میں انہوں نے بھی خانہ جنگی شروع کر رکھی تھی جس کا اختتام اس وقت ہوا جب اقتدار کلہوڑا حاکموں کے ہاتھوں سے نکل کر تالپوروں کے ہاتھوں میں آیا۔

ان مسلسل جنگی حالات سے مقابلے کرنے، لگاتار حملوں سے نبرد آزما رہنے، باج گذاری، اطاعت گذاری اور تاوان کی طلب پوری کرنے سے سندھ کے عوام کی اقتصادی حالت زبوں اور پست ہوگئی۔ معاشرتی حالات الگ سے دگرگوں رہے اور زراعت کا حال تو یہ ہوگیا کہ مختصر عرصے کے اندر سندھ دوبارہ قحط زدہ اور وبائی امراض کی آماجگاہ بن گیا۔

انسانی آمد و رفت اور حمل و نقل کے لیے ان دنوں گھوڑے ہی تیز رفتار سواری ہوتے تھے۔ تمام حملہ آور چونکہ گھوڑوں پر آتے، تشدد، ظلم و بربریت کا مظاہرہ کرتے اور

لوگوں کو چیخ و پکار میں مبتلا چھوڑ کر چلے جاتے تھے اس لیے روز مرہ کی بول چال میں درج ذیل محاورے اور اصطلاحیں شامل ہوئیں: اگر کربلا کے سانحے سے ملتا جلتا انسانیت سوز کوئی واقعہ ہو تو اس کا اظہار "یا حسین" کہہ کر کیا جاتا ہے۔ جبکہ اگر کہیں حملہ آوروں کی طرح لوٹ مار، قتل و خونریزی، جلاؤ اور مارو کی سفاکانہ کارروائی ہو رہی ہو تو اس کے لیے "گھوڑا ڑے گھوڑا" کا زوردار فقرہ ادا کیا جاتا ہے۔

سندھی زبان میں گھل کا لفظ لشکر کشی یا فوج کشی کے لیے استعمال ہوتا ہے چنانچہ دور حاضر میں بھی اگر کسی شخص کو بددعا دی جاتی ہے تو اس کے لیے یہی کیا جاتا ہے کہ "شل کا گھل پوئی۔" (اللہ کرے تم پر فوج کشی ہو)۔

اگرچہ اس طرح کے دیگر فقرے، جملے، دعائیں، بددعائیں، محاورے اور اصطلاحیں وغیرہ اپنے عہد کے تاریخی حالات کی گواہی دیتے ہیں تاہم شاعر اس سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس لیے جو بھی حالات دیکھتا ہے اور جن حالات سے معاشرے کو گذرتے دیکھتا ہے، اس کا اظہار وہ اشعار میں کر دیتا ہے۔ لہٰذا کاہوڑا دور میں جو شاعری ہوئی اس کے موضوعات کو درج ذیل عنوانات کے تحت پیش کیا جاتا ہے:

۱- وطن پرستی جسے عمر مارئی کی داستان کے پس منظر میں پیش کیا جاتا اور مارئی کے کردار کی وطن اور ہم وطنوں سے گہری وابستگی کو نمایاں کیا جاتا۔ اس وقت مروجہ شعری اصناف "کافی"، "دوہڑہ"، "ابیات" اور وائی وغیرہ کے ذریعے مذکورہ موضوع کا اظہار کیا جانے لگا۔

۲- سہنی میہار کی تمثیل کی اوٹ ملکی حالات کو نمایاں کرنے کے لیے دریا کی دہشت، منجھدار، بھنور، اندھیری رات، وسوسے، خدشات پر خطر ماحول، وحشت ناک سیلابی صورتحال، مل جل کر چپو چلانے، کشتی کو سلامتی سے پار لگانے، گھات میں بیٹھے وحشی اور سفاک درندوں سے خبردار رہنے، ظاہر میں موسیٰ اور اندر میں ابلیس جیسے کرداروں کی

چالبازی سے باخبر رہنے، انسان ذات کے خیر خواہ کی پہنچان کرنے، آدمیت کی عزت اور اس سے پیار بڑھانے، اخوت اور بھائی چارے کو فروغ دینے، خطروں سے کھیلنے اور خوف سے نہ گھبرانے کی تلقین کی جاتی۔ اہل تصوف، اہل اللہ اور اہل ایمان جہاں بھی جاتے لوگوں کو اللہ پر بھروسہ کرنے، اسی سے مدد مانگنے، اللہ اور اس کے رسول، یوم حساب اور ملائکہ پر ایمان لانے کی ہدایت کرتے رہتے۔

مختلف مذہبی مسالک سے وابستہ مبلغ، الگ سے دعوت دین دینے میں مصروف رہتے تھے۔ ایسے لوگوں کی محافل، مجالس اور ذکر و فکر کے اجتماعات ہوتے، ان میں مناقبا، مناظرہ، مدح، حمد، نعت، مولود، بیت، وائی اور کافی وغیرہ کی شعری اصناف کے ذریعے حاضرین کو مسحور کیا جاتا۔

اگرچہ ایسی اصناف کا وجود دینی موضوعات سمونے کے لیے تھا، لیکن حالات کے پیش نظر اشاروں کنایوں اور تمثیلوں کے وسیلے اپنے عہد کے حقائق بھی پیش کیے جانے لگے، جس کی وجہ سے مذکورہ اصناف میں جدت، وسعت اور کشادگی آئی۔ حتی کہ مولود جیسی خالص مذہبی موضوع کو سمونے والی صنف میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیاوی قید، اذیت گاہوں، دوزخ، مصائب و مشکلات سے نجات دلانے کے لیے پکارا جاتا۔ غرضیکہ شعراء، علماء اور ادیبوں کا ایک طبقہ آہوں، آنسوؤں اور سسکیوں سے لبریز ادب تخلیق کرنے میں مصروف تھا تو دوسرا طبقہ جو فارسی کو ذریعہ اظہار بنانے کا حامی تھا، اس کا انداز پہلے طبقے سے مختلف تھا۔

(جاری ہے)